ڈاکٹر مبارک علی

ہندوستان کی سیاست میں ترکی غلاموں کا حصہ

پس منظر

دنیا کی تاریخ میں، انسانوں کو بھی جانوروں کی طرح سدھا کر اور تربیت دے کر اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا گیا اور یہیں سے تاریخ میں غلامی کی ابتدا ہوئی۔ غلامی کے ادارے کو اس وقت تقویت اور قوت ملی جب بادشاہ یا حکمران بنیادی حمایت سے محروم ہو گئے یا جب انھوں نے مطلق العنانیت کو اختیار کیا اور تمام اختیارات اپنی ذات میں جمع کر لیے تو اس وقت وہ عوامی حمایت اور مقبولیت سے دور ہوتے چلے گئے، اس کمی اور خلا کو انھوں نے غلامی کے ادارے سے پُر کیا۔

اسلام میں بنو اُمیہ کی حکومت قائم ہوئی تو اس کی بنیاد عربی عصبیت پر تھی اور حکومت کے اقتدار میں صرف عربوں کو حصہ ملا جب کہ مفتوحہ علاقوں کے مسلمان اس سے محروم رہے۔ یہی محرومی کا جذبہ "عباسی انقلاب" کا باعث بنا، جو ایران اور عربوں کی مشترکہ کوشش کی وجہ سے کامیاب ہوا اور اس کامیابی کے بعد ایرانیوں کو بھی حکومت میں حصہ ملا، لیکن بہت بعد عباسی خلافت استبداد اور مطلق العنانیت کی جانب بڑھی، جہاں آہستہ آہستہ ایرانی اور عرب اختیارات سے محروم ہوتے چلے گئے، اور اس کی جگہ ترکی غلاموں کے ادارے نے لے لی۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں اس عمل کی نشاندہی کی ہے کہ جب بادشاہ خود مختاری کا دل دادہ ہو جاتا ہے تو اپنی قوم کے افراد کو سلطنت میں حصہ نہیں دیتا اور غیر قوم سے مدد طلب کر کے اپنی قوم پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ نیا طبقہ بادشاہ کا انتہائی وفادار ہوتا ہے اور اس کی خدمت میں جان کی بازی لگا دیتا ہے، اس لیے بادشاہ کی اس طبقے پر مہربانی بڑھتی چلی جاتی ہے، اور وہ انھیں بڑے بڑے عہدے، عالی شان خطابات اور بڑی بڑی جاگیریں دیتا ہے[1]

خلیفہ المتوکل نے خاص طور سے ترکی غلاموں کے ادارے کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے استعمال کیا۔

---

[1] ابن خلدون: مقدمہ ابن خلدون، اردو ترجمہ مولانا سعد حسن خاں، کراچی - ص ۱۸۸، ۱۸۹

بعد میں عباسی خاندان کے زوال کے دور میں مشرق اور مغرب میں جب آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں تو ان حکومتوں کی بنیاد فوجی طاقت پر تھی اس لیے کہ ان کی عوام میں کوئی جڑیں نہیں تھیں، اور نہ ان حکمرانوں کا، جن ملکوں پر وہ حکومت کر رہے تھے، عوام سے کوئی واسطہ تھا، بلکہ اکثر صورتوں میں یہ حکمران غیر ملکی اور پردیسی تھے، اس لیے ان حالات میں ان کی حکومت کی بنیاد صرف طاقت اور استبدادی اداروں پر تھی۔ حکومت کے اقتدار میں وہ خود اس ملک کے لوگوں کو شریک کرنا نہیں چاہتے تھے، کیوں کہ اقتدار میں اُن کی شرکت بغاوت یا شورش کی موجب ہو سکتی تھی۔ لہٰذا انھوں نے عباسی دور کے قائم شدہ ترکی غلاموں کے ادارے کو اپنایا اور انھیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا، مثلاً صفاری خاندان کے بانی یعقوب بن لیث (۸۶۸ - ۸۷۸) کے پاس دو ہزار غلام تھے جو اس کے ذاتی ملازم بھی تھے اور اس کے محافظ دستے میں بھی۔ اس کے بھائی عمر بن لیث (۸۷۸ - ۹۰۰) کا یہ دستور تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے لڑکوں بحیثیت غلام کے خریدتا تھا اور ان کی تربیت کر کے انھیں اپنے فوجی جرنیلوں کو دے دیتا تھا، جہاں وہ بحیثیت جاسوس کے کام کرتے تھے اور اس کو ہر قسم کی اطلاعات بہم پہنچاتے تھے۔

مرداویج بن زیاد نے جو دیلم کا حکمران تھا، ترکی غلاموں کی تعداد میں اضافہ کیا اور انھیں تین مقاصد میں استعمال کیا، فوجی ملازمت میں، ذاتی خدمت میں اور جاسوسی کے لیے۔

سامانیوں نے اقتدار میں آنے کے بعد اس ادارے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان کا مشہور سپہ سالار اسماعیل بن احمد (وفات ۹۰۷) ایک غلام تھا۔ سامانیوں نے ترکی غلاموں سے ایک اور مقصد کو پورا کیا یعنی اپنی سلطنت سے ایرانیوں کے طاقت ور عنصر کا خاتمہ کر دیا۔ ان کے ہاں ترکی غلاموں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ نصر بن احمد (۹۱۴ - ۹۴۳) کے عہد میں ان کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ سامانیوں کے عہد ہی میں الپ تگین کو عروج حاصل ہوا اور بعد میں اس نے غزنوی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

گیارھویں صدی عیسوی تک ترکی غلاموں کا ادارہ اس قدر مستحکم ہو چکا تھا اور اس کے فائدے حکمرانوں کے سامنے اس قدر ظاہر ہو چکے تھے کہ انھوں نے ان غلاموں سے اپنی فوج تیار کی۔

ترکی غلاموں کے اس اقتدار میں ان کی اپنی خصوصیات اور اوصاف کو بڑا دخل ہے۔ ان کی وفاداری، بہادری، شجاعت اور سادہ کردار کی وجہ سے انھیں بڑی مقبولیت ملی۔ ان غلاموں کے لیے سوائے ان کے آقا کے اور کوئی شخصیت قابلِ احترام نہیں ہوتی تھی۔ خاندان، رشتہ داروں، ماں باپ اور دوستوں سے

محروم یہ طبقہ صرف بادشاہ کی ذات کا وفادار ہوتا تھا۔ چوں کہ یہ غلام بادشاہ کی جائداد ہوتے تھے، اس لیے ان غلاموں کی تمام دولت، جائداد اور مال و منال بھی اسی کا ہوتا تھا۔ ان کے مرنے کے بعد وہی اُن کا وارث ہوتا تھا۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ تھا کہ اس طرح سے ملک کی تمام جاگیریں، جائدادیں اور مال و دولت اگرچہ تقسیم کیا جاتا تھا، مگر درحقیقت ان کا مالک درپردہ بادشاہ ہوتا تھا۔ اس وجہ سے سلطنت میں امرا کا کوئی طاقت ور طبقہ وجود میں نہیں آسکا جو بادشاہ کی طاقت و اقتدار کو چیلنج کر سکے۔ اس طرح فوج کے تمام افسر، سپہ سالار اور جنرل ترک غلام ہوا کرتے تھے، جن کا کام یہ تھا کہ سلطنت میں ہونے والی تمام بغاوتوں، شورشوں اور سازشوں کو ختم کر دیں۔ یہ مسلسل فتوحات کے ذریعے سلطنت کی حدود اور آمدن میں اضافہ بھی کرتے رہتے تھے۔ اس کی وجہ سے بادشاہ اور اس طبقے میں باہمی اعتماد پیدا ہو جاتا تھا۔

غلاموں کی تعداد بڑھنے کے بعد ان کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا جاتا تھا، ایک طرف وہ غلام تھے جن میں زیادہ لیاقت و قابلیت نہیں ہوتی تھی اور وہ بادشاہ کی معمولی ذاتی خدمات پر مامور رہتے تھے اور ان میں سے اکثر ان ہی عہدوں یا ملازمتوں پر کام کر کے زندگی گزار دیتے تھے، لیکن وہ غلام جن میں کوئی صلاحیت ہوتی تھی، وہ اپنی ذاتی خدمت کے دوران بادشاہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے اور بہت جلد اعلیٰ عہدوں پر ترقی کرتے ہوئے "غلامانِ خاص" یا "غلامانِ سلطانی" کے درجے پر پہنچ جاتے تھے[۲]۔

ترک غلاموں کی اس قدر تعداد اس طرح سے آتی تھی کہ ان کی بڑھتی ہوئی مانگ نے اس تجارت کو زبردست فروغ دیا تھا اور ماوراء النہر کی منڈیوں میں ترک غلاموں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ یقینی بات ہے کہ غلاموں کے حصول اور منافع کے احساس نے انسانیت پر فتح پالی ہوگی، کیوں اس کے بغیر انسانوں کی تجارت کو فروغ نہیں ہو سکتا تھا۔

ان غلاموں کے حصول کا ایک ذریعہ قبیلوں کی آپس میں جنگیں ہوا کرتی تھیں جن میں شکست خوردہ قبیلوں کے لڑکوں اور عورتوں کو غلام بنالیا جاتا تھا اور پھر انھیں تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا تھا، جو انھیں شہروں کی منڈیوں میں لاکر ان کی عمر، جسمانی خوب صورتی اور ذہانت کی بنیاد پر مختلف قیمتوں پر فروخت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ ماں باپ غربت و مفلسی سے مجبور ہو کر اپنی اولاد کو فروخت کر دیتے تھے، تاکہ

---

۲ C. E. Bosworth : The Ghaznavids. Edinburgh 1963. p 99-101

اس صورت میں انھیں کسی امیر کے گھرانے یا بادشاہ کے ہاں ترقی کے زیادہ مواقع مل سکیں۔

ترکی غلاموں کی مقبولیت کے پیشِ نظر یہ دستور بھی تھا کہ انھیں تحفتہً باج گزار حکمران اور امرا بادشاہ کو دیا کرتے تھے۔ ایک اچھے غلام کا تحفہ دوسرے تمام تحفوں سے ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ ارسلان خان منصور (۱۰۱۵ - ۱۰۲۴) کی بیوی ہر سال سلطان محمود غزنوی کو ایک کنیز اور مرد غلام تحفے میں بھیجا کرتی تھی۔ سلطان محمود نے جب خوارزم پر حملہ کیا تو شکست خوردہ بادشاہ کے تمام غلام مالِ غنیمت کے طور پر اُسے ملے، اس طرح ماوراء النہر کی مہم (۱۰۲۵) میں جو علی تگین کے خلاف تھی، محمود نے اس سے ایک ہزار غلام بطور خراج لیے۔[۵۳]

غلاموں کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ دستور ہو گیا تھا کہ جنگ کے خاتمے پر جو غلام ان کے ہاتھ آتے، ان میں سے بہترین غلاموں کو بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا جاتا تھا۔ غلاموں کی ترقی اور عروج میں ان کی قسمت اور حالات کا بڑا دخل ہوتا تھا۔ اگر وہ خوش قسمت ہوتے اور ان امرا کے غلام بن جاتے جو نیک و رحم دل ہوتے تھے تو انھیں اس کا موقع مل جاتا تھا کہ وہ مختلف علوم و فنون حاصل کر سکیں، اگرچہ ان غلاموں کی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص طریقہ تو نہیں تھا، مگر یہ غلام اکثر اپنے ذاتی شوق اور موافق حالات کے تحت کچھ نہ کچھ سیکھ لیا کرتے تھے۔ اس سے مالک کو بھی فائدہ تھا کہ فروخت کی صورت میں تعلیم یافتہ اور باہنر غلام زیادہ قیمت لاتا تھا۔

ان غلاموں کو جنھیں بادشاہ خریدتا تھا، ابتدا میں اسی کی ذاتی خدمت پر مامور کیا جاتا تھا جیسے ساقیِ خاص، چاشنی گیر، طشت دار، پوزبان، مشعل بردار، سرچتردار، سرآب دار، خاصہ دار، جامہ دار سلح دار اور علم دار وغیرہ، اس کے بعد جن غلاموں میں لیاقت ہوتی، وہ ترقی کرتے ہوئے فوج کے جنرل اور صوبوں کے گورنر تک ہو جاتے تھے۔ دربار کے اعلیٰ عہدے بھی ان ہی ترکی غلاموں کو ملتے تھے، جن میں امیرِ مجلس، امیرِ حاجب اور امیرِ شکار رہوا کرتے تھے۔

ترک غلاموں کے وسیع اختیارات کے جہاں بہت سے فائدے ہوئے، وہاں اس کے مضر اثرات بھی نکلے، کیوں کہ یہ اصول رہا ہے کہ ایک مرتبہ جب تمام اقتدار غلاموں کے طبقے میں منتقل ہو گیا اور ان کی طاقت کو کوئی دوسرا عنصر یا طبقہ چیلنج کرنے والا نہیں رہا تو انھوں نے اپنی طاقت کا بے جا استعمال کیا۔ چنانچہ

---

۵۳ E. Bosworth : The Ghaznavids. Edinburgh 1963, p 101.

ہوا کہ ایک طاقت ور بادشاہ کی موجودگی میں تو یہ غلام اس کے وفادار رہے، لیکن ایک کمزور بادشاہ کے دربار میں انھوں نے اپنی طاقت کا ناجائز استعمال کیا۔ نئے بادشاہ کی تخت نشینی میں ان ترک غلاموں کی رائے کو بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ اس لیے اکثر ایسا ہوا کہ بادشاہ کے نامزد جانشین کے بجائے، اپنی پسند کے کسی شہزادے کو تخت نشین کرادیا اور اس سے فوائد حاصل کیے۔ اس وجہ سے اکثر شاہی خاندان، ان ترکی غلاموں کی سیاسی کش مکش اور سازش کی وجہ سے ختم ہو گئے۔

سلطان معزالدین غوری اور اس کے غلام

غزنوی حکومت کی بنیاد الپ تگین نے ڈالی تھی، جو سامانیوں کا غلام تھا، اسی کے ایک اور ترک غلام سبک تگین نے اس کو نہ صرف مستحکم کیا بلکہ فتوحات کے ذریعے سلطنت کی توسیع بھی کی۔ غزنوی سلطنت کے بعد جب غوریوں نے اپنی حکومت کی بنیاد ڈالی تو انھوں نے بھی ترک غلاموں کے ادارے کو نہ صرف اپنایا بلکہ اس میں نئی جان ڈالی۔ سلطان معزالدین غوری کے کوئی اولاد نہ تھی، صرف ایک لڑکی تھی، اس کو ترک غلام خریدنے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ جب وہ کسی غلام کی تعریف سنتا تو اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اسے اپنے غلاموں سے قلبی لگاؤ اور محبت تھی، اسی لیے جب کسی درباری نے اس سے یہ سوال کیا کہ آپ کے بعد آپ کا جانشین کون ہوگا؟ تو سلطان نے فوراً جواب دیا: "دوسرے بادشاہوں کے ایک یا دو لڑکے ہوں گے، جب کہ میرے ہزاروں لڑکے ہیں"[۵۴] اس کی مراد اپنے ترکی غلاموں سے تھی، جنھوں نے آگے چل کر اس کے نام کو زندہ کیا۔

معزالدین کے یوں تو ہزاروں غلام تھے، لیکن تین غلاموں نے خصوصیت سے اس کے عہد میں اور بعد میں زیادہ نام پیدا کیا۔ یہ تھے، تاج الدین یلدوز، قطب الدین ایبک اور ناصرالدین قباچہ۔ ان تینوں غلاموں کی ابتدائی تاریخ سے غلاموں کے اس نظام کا اندازہ ہوتا ہے جو اس وقت قائم تھا اور یہ کہ وہ جس انداز، طریقے اور نہج پر کام کر رہا تھا۔ مثلاً تاج الدین یلدوز کو ابتدائی عمر میں سلطان معزالدین نے خریدا، ابتدا میں اس نے معمولی کام کیے، لیکن بعد میں ترقی کر کے وہ "غلاموں کا سردار ہو گیا اور اس کے بعد کرمان اور سنقران کی جاگیریں اسے ملیں، وہ سلطان کے محبوب غلاموں میں سے تھا اور اس کا یہ دستور تھا کہ سلطان

---

۵۴ منہاج سراج: طبقات ناصری، کابل ۱۹۶۳ء، ج ۱، ص ۳۱۰-۳۱۱

ہر سال ہندوستان سے واپسی پر اس کے پاس قیام کرتا، اس موقع پر یلدوز ایک شان دار ضیافت کا انتظام کرتا اور ایک ہزار خلعتیں اور ٹوپیاں مہمانوں میں تقسیم کرتا۔ جب آخری مرتبہ سلطان اس کے پاس ٹھہرا تو اس نے ایک خلعت اور ٹوپی اپنے لیے پسند کی اور یلدوز کو نشانِ سیاہ (چتر) اور اپنا ملبوسِ خاص دیا۔ سیاہ چتر دینے کا یہ مطلب بھی تھا کہ وہ اسے اپنا جانشین مقرر کرنا چاہتا ہے[۵۵]

قطب الدین ایبک کی ابتدائی زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے ابتدا میں نیشاپور میں قاضی فخر الدین نے خریدا اور اپنے بچوں کے ہمراہ اسے بھی تعلیم و تربیت دی، بعد میں اسے غزنی لے جا کر سلطان معز الدین کے ہاتھ فروخت کیا۔[۵۶] اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ابتدا ہی سے بڑا فیاض اور سخی تھا۔ ایک مرتبہ ایک مجلسِ نشاط کے موقع پر سلطان نے اسے انعامات و اکرام سے نوازا تو اس نے اپنے تمام انعامات محفل سے باہر آ کر ملازموں میں تقسیم کر دیے۔ یہ سن کر سلطان اس سے بہت خوش ہوا اور اس پر پہلے سے زیادہ توجہ کرنے لگا۔[۵۷] اگرچہ وہ خوب صورت نہیں تھا لیکن اس میں بڑی صلاحیتیں تھیں، اس لیے وہ ترقی کر کے امیر اخور (شاہی اصطبل کا انچارج) ہو گیا۔ اس کے بعد اسے کہرام کا گورنر بنایا گیا اور پھر ہندوستان کی فتح کے بعد وہ یہاں کا وائسرائے بنا۔[۵۸]

تیسرا غلام ناصر الدین قباچہ تھا جس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اسے ابتدا ہی سے دربار میں اہم خدمات دی گئیں اور وہ سلطان کا مقربِ خاص ہو گیا۔ جب سلطان کا ایک اور غلام ناصر الدین ایتمر، خوارزم شاہ کی جنگ میں مارا گیا تو اس کی ملتان اور اوچ کی جاگیر قباچہ کو دے دی گئی، جہاں وہ آخر تک حکمران رہا۔[۵۹]

سلطان معز الدین کی یہ خواہش تھی کہ اس کے غلاموں میں اتحاد اور دوستی قائم رہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ان تینوں کے درمیان شادی و بیاہ کے تعلقات قائم کر دیے۔ چنانچہ یلدوز کی دو لڑکیاں، ایبک اور قباچہ کے ساتھ بیاہی گئیں اور ایبک کی دو لڑکیاں یکے بعد دیگرے قباچہ کے نکاح میں آئیں۔[۶۰]

---

۵۵ منہاج سراج: طبقاتِ ناصری، کابل ۱۹۶۳ء، ج ۱، ص ۴۱۱-۴۱۲

۵۶ ایضاً، ص ۴۱۶

۵۷ ایضاً، ص ۴۱۶

۵۸ ایضاً، ص ۴۱۸

۵۹ ایضاً، ص ۴۱۹

۶۰ ایضاً، ص ۴۱۱

یہ اتحاد سلطان کی زندگی میں تو رہا لیکن اس کی وفات کے بعد سیاسی طاقت کے حصول میں یہ پاش پاش ہوگیا، کیوں سلطان معزالدین کی وفات کے بعد اس کے غلام اس کے جانشین ہوئے اور سلطان محمود نے جو اس کا بھتیجا تھا، فیروزکوہ میں رہنا پسند کیا۔ اس نے تاج الدین یلدوز اور قطب الدین ایبک کو غلامی سے آزادی کا خط بھیجا اور ساتھ ہی انھیں چتر اور خطاب دے کر ان کے علاقوں میں خود مختاری دے دی۔ ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت نہیں کہ قباچہ کو بھی کوئی ایسا خط یا خطاب یا شاہی علامت ملی ہو۔ سلطان کے مرنے کے بعد یلدوز غزنی میں اور ایبک دہلی میں خود مختار ہوگئے۔ قباچہ اگرچہ خود مختار تھا لیکن وہ شاید احتراماً ایبک کی زندگی میں اس کا وفادار رہا اور اکثر اوچ سے اس کے پاس دہلی بھی جاتا رہا۔ یلدوز کی ایبک اور قباچہ دونوں سے جنگیں ہوئیں اور بالآخر (۱۵-۱۲۱۶ء میں) التتمش کے ہاتھوں اسے شکست ہوئی[۱۱]

التتمش نے تخت نشین ہونے کے فوراً بعد ایک مضبوط بادشاہت کی کوشش کی اور اس نے یلدوز کے بعد (۱۲۲۸ء میں) قباچہ کو شکست دے کر ختم کر دیا۔

التتمش اور ترکی غلام

التتمش کے دربار میں سلطان معزالدین کے ترکی غلاموں کی کافی تعداد موجود تھی۔ یہ معزّی کہلاتے تھے، لیکن التتمش کے زمانے میں ان کا اثر و رسوخ کم ہوچکا تھا، کیوں کہ التتمش نے خود ترکی غلام خرید کر اپنا ایک "وفادار طبقہ" پیدا کرلیا تھا، اس لیے کہ اسے اندازہ تھا کہ وہ معزّی غلاموں پر بھروسا نہیں کرسکتا ہے۔ ہمیں التتمش کے ان غلاموں کے تذکرے ملتے ہیں جنھوں نے اس کے عہد میں ترقی کی اور دربار کے اہم عہدوں پر فائز رہے۔ مثلاً ملک تاج الدین سنجر کزلک (وفات ۱۲۳۱ء) ایک مشہور غلام تھا، جسے التتمش نے بچپن میں خریدا تھا، اس کی پرورش ناصرالدین محمود کے ساتھ ہوئی تھی۔ ابتدا میں اسے چاشنی گیر کا عہدہ ملا، پھر داروغۂ اصطبل اور قباچہ کے خاتمے کے بعد ملتان، کہرام اور تبرہند (بھٹنڈہ) کا حاکم ہوا[۱۲]

سیف الدین ایبک یغان تتر (وفات ۱۲۳۳ء) بھی التتمش کے غلاموں میں سے تھا۔ یہ امیر مجلس کے اہم عہدے پر فائز ہوا اور بعد میں بہار و لکھنوتی کی ولایت اسے ملی[۱۳]۔ ملک عزالدین طغان خاں طغرل (وفات

---

[۱۱] منہاج سراج: طبقاتِ ناصری، کابل ۱۹۶۳ء - ج ۱، ص ۴۱۲ - ۴۱۳ - ۴۱۸

[۱۲] ایضاً - ج ۲، ص ۳-۴ [۱۳] ایضاً، ص ۹-۱۰

۱۲۴۷ء التتمش کا ساقیِ خاص، سردارانِ دار، چاشنی گیر، داروغۂ اصطبل اور آخر میں بدایوں کا گورنر ہوا۔[۱۴] ملک اختیار الدین التونیہ نے سرآب دار سے ترقی کر کے تبرہندہ کی گورنری حاصل کی۔

یہ تمام ترکی غلام سلطنت کے اہم اور با اثر عہدوں پر قابض تھے اور اسی وجہ سے دربار میں ان کا ایک طاقت ور گروپ تھا، جو بعد میں "امیر چہل گانہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ چوں کہ ایبک اور التتمش کا تعلق غلاموں سے تھا، کسی شاہی خاندان سے نہیں تھا، اس لیے ان کے خاندان کی وفاداری کی جڑیں امرا اور عوام میں گہری نہیں تھیں، یہی وجہ ہے کہ التتمش کے بعد کچھ ترک غلاموں نے یہ کوشش کی کہ وہ سلطنت پر قابض ہو جائیں، ان میں ملک التونیہ، ملک اختیار الدین بوزبک اور ملک عزالدین کشلو خاں نے بغاوت کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا، مگر اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔

ان غلاموں میں سے خاص خاص غلام، شاہی خاندان سے شادی کے ذریعے تعلق قایم کر کے، اس خاندان کا حصہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ایبک نے اپنی لڑکی کی شادی التتمش سے کر دی، ملک التونیہ نے سلطانہ رضیہ سے شادی کی اور بلبن نے اپنی لڑکی کی شادی ناصر الدین محمود سے کر دی۔ اس ذریعے سے ایک خاص طبقہ پیدا کر لیا جاتا تھا تاکہ شاہی خاندان کو استحکام مل سکے۔[۱۵]

اس سیاسی ڈھانچے کا یہ اثر ہوا کہ حکومت اور حکومت کے تمام ادارے اور تمام سیاسی اختیارات صرف ترک غلاموں میں محدود ہو کر رہ گئے، اس لیے لازماً ان کی یہ کوشش تھی کہ یہ ڈھانچہ اسی طرح برقرار رہے اور ان کی مراعات اسی طرح قائم رہیں۔ اس جذبے نے امیر چہل گانہ کو جنم دیا۔

امیر چہل گانہ

یہ چالیس امیر التتمش کے غلام تھے جنھوں نے اپنی ایک طاقت ور اور مضبوط جماعت بنالی تھی۔ یہ غلام اس کی زندگی میں تو اس کے وفادار رہے لیکن اس کی وفات کے بعد انھوں نے ہر نئے بادشاہ کے انتخاب میں دخل دینا شروع کیا اور اپنی مرضی کے حکمران تخت نشین کرانے لگے جس کی وجہ سے ہندوستان کی سلطنت سیاسی انتشار کا شکار ہو گئی اور اس انتشار میں ان کی طاقت میں مزید اضافہ ہوا، کیوں کہ بادشاہت کے مستحکم ادارے کے ختم ہونے کے بعد ان ہی کی طاقت باقی رہ گئی تھی۔

---

[۱۴] منہاج سراج، طبقات ناصری، حصہ دوم، ص ۱۳

[۱۵] ایضاً، ص ۵۹

ضیاء الدین برنی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ :

" بندگانِ شمس چوں کہ ایک ہی آقا کے غلام تھے اور وہ چالیس کے چالیس ایک ہی وقت میں بلند مقام پر پہنچے تھے، اس لیے وہ ایک دوسرے کی اطاعت نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے سامنے سر جھکاتے تھے اور اقطاع، لشکر اور بزرگی و مرتبے میں سب کے سب برابری اور مساوات کا مطالبہ کرتے تھے، ان میں سے ہر ایک شیخی مارتا کہ میں ہی سب کچھ ہوں، میرے علاوہ اور کوئی نہیں ..."[۱۶]

جب بلبن بادشاہ بنا تو اس نے اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ اس کی بادشاہت اسی صورت میں قایم رہ سکتی ہے کہ امیر چہل گانہ کا خاتمہ ہو جائے۔ اپنے ابتدائی زمانے میں وہ خود بھی ان میں سے ایک تھا اور اس گروہ کی طاقت اور قوت سے پوری طرح آگاہ تھا، اس لیے اس نے ایک ایک کر کے ان غلاموں کو مختلف ذریعوں سے قتل کرا کے ان کا زور توڑ دیا۔[۱۷]

امیر چہل گانہ کے خاتمے کے ساتھ ہی ہندوستان سے ترکی غلاموں کے اثر و رسوخ اور اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ بلبن کے خاندان کے بعد جو حکمران آئے، وہ خالصتاً ترک نہیں تھے، اس لیے اگرچہ انھوں نے غلامی کا ادارہ تو قائم رکھا لیکن ترک غلام ہندوستان نہیں آتے تھے، کیوں کہ اب ترک غلاموں کی سپلائی اتنی زیادہ تعداد میں نہیں ہو سکتی تھی، ہندوستانی غلاموں نے انفرادی طور پر تو ترقی کی جیسے ملک کافور اور خسرو خاں مگر بحیثیت مجموعی یہ ترک غلاموں کی مانند اقتدار پر قابض نہیں ہو سکے۔

ہندوستان میں ترکی غلاموں کے ادارے کو اس وقت زوال ہوا جب ہندوستان میں ان کے مقابلے میں دوسری جماعتیں مثلاً خلجی اور تغلق پیدا ہوئے۔ انھوں نے برسر اقتدار آ کر ان غلاموں کے بجائے اپنے لوگوں پر اعتماد کیا۔ محمد بن تغلق نے ان کے بجائے غیر ملکیوں کو اقتدار میں شریک کرنے کا طریقہ اختیار کیا، جو زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ فیروز شاہ نے غلامی کے ادارے کے احیا کی کوشش کی، مگر اس کے غلام ہندوستانی تھے اور ان کے پس منظر میں ترکی غلاموں جیسی تعلیم و تربیت نہیں تھی، اس لیے وہ کامیاب نہیں ہوئے۔

ہندوستان میں ترکی غلاموں کے مستحکم ادارے کو بلبن نے ختم کیا اور بعد کے سیاسی حالات نے اس کو بالکل مٹا دیا لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان ترکی غلاموں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام و استحکام میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔

---

[۱۶] ضیاء الدین برنی : تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ) لاہور ۱۹۷۹ء، ص ۷۵

[۱۷] ایضاً، ص ۱۰۴-۱۰۵

مسلمانوں کے سیاسی افکار

پروفیسر رشید احمد

مسلمان مفکروں نے سیاسی نظریہ سازی کی تاریخ میں بہت اہم ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب میں مختلف زمانوں اور مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے مسلمان مفکروں اور مدبروں کے سیاسی نظریات پیش کیے گئے ہیں۔

یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں قرآنی نظریۂ مملکت کی بہ خوبی وضاحت کی گئی ہے، جو ان سب مسلمان مفکروں کے نظریوں کی اساس ہے۔

یہ کتاب بی، اے کے نصاب میں داخل ہے۔

صفحات ۸ + ۳۴۲ قیمت ۲۵ روپے

اسلامی جمہوریت

مولانا رئیس احمد جعفری

درحقیقت جمہوریت ہے کیا؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ اس کے حدود و خصائص کیا ہیں؟ اس کا تحفظ کس طرح کیا جاتا ہے اور یہ کہ "سلطانی جمہور" واقعی ایک بامعنی لفظ ہے بھی یا نہیں؟ اسلام نے جس جمہوریت کا خاکہ پیش کیا ہے اور جس جمہوریت سے دنیا کو روشناس کرایا ہے اور جس طرح اسے برت کر اس کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے، اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل منفرد اور یکتا ہے — اس کتاب میں بسط و تفصیل، صحت و استناد اور کتاب و سنت کی روشنی میں اسلامی جمہوریت کی وضاحت کی گئی ہے۔ وہ جمہوریت جو حقیقی اور خالص ہے۔

صفحات ۲۴ + ۴۰۴ قیمت ۱۸ روپے

ملنے کا پتا: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور